وقت ناول کا اصل امتحان ہے

اداس نسلوں کے قصّہ گو، ممتاز فکشن نگار، عبداللہ حسین سے خصوصی مکالمہ

اقبال خورشید

یہ محبت سے جنم لینے والی سردیوں کی بے انت تنہائی تھی، جس سے نبرد آزما ہونے کے لیے میں نے خود کو ایک طویل حزنیہ کے حوالے کر دیا۔ اور بعد میں اس فیصلے پر جشن منایا۔

''اداس نسلیں'' سے گزرنے کے بعد تین انکشافات ہوئے۔ پہلا؛ یہ پُرقوت ماجرا محبت، جنگ اور ہجرت کے نئے گوشے آشکار کرتا ہے۔ دوسرا؛ قارئین کو اِسے دوبارہ پڑھنے سے باز رکھنا ناقدین کے بس کی بات نہیں۔ اور تیسرا؛ یہ آپ کو گرویدہ بنا سکتا ہے۔

البتہ اِس کے مصنف سے یوں روبرو ہونے کی خواہش کہ غیر مربوط سوالات سے اُسے تھکا سکوں، تب پیدا ہوئی، جب ''باگھ'' کی دوسری قرات کے دوران میں نے جانا کہ بیرونی جبر سے گُندھا یہ قصّہ ہر اُس ناول کے مقابلے میں، جو کبھی میں نے پڑھا، خود کو پڑھوانے کی زیادہ قوت رکھتا ہے۔ اِس کی بہ ظاہر سادہ، مگر جاوداں نثر میں بہاؤ ہے۔ زندگی کے ناگزیر حقائق بیان کرنے کے لیے ناول نگار نے ایک ایسا جال بچھایا ہے، جو پہلی سطر پڑھتے ہی آپ پر آن گرتا ہے:

''رات کو اسدی۔'' یاسمین نے کہا تھا۔ صبح کی روشنی میں اُس کا چہرہ دمک رہا تھا۔

یہ محبت کے نام ونشاں پیدا کرنے والے عبداللہ حسین کا تذکرہ ہے، جو ان کے راستے میں دکھائی دیتے ہیں، اور کبھی ماند نہیں پڑتے۔

دبدبہ وہ پہلا احساس ہے، جو عبداللہ حسین سے متعلق مجھ میں پیدا ہوا، جسے اخبارات اور ویب سائٹس پر شایع ہونے والی اُن کی تصاویر نے مہمیز کیا، اور ایک مودبانہ فاصلہ میں نے ضروری جانا۔ یہ کچھ برس قبل لاہور میں ہونے والی ایکسپریس اردو کانفرنس تھی، جس کی بھاگ دوڑ نے مجھے

ٹیلی فون لائن کے ذریعے اُن سے جوڑ دیا۔ اُدھر لاہور میں بھی سامنا ہوا، پر مودبانہ فاصلہ قائم رہا۔ پہلی دراڑ اُس پل پڑی، جب سیشن کے تمام اسپیکرز کے بعد، جو پی ایچ ڈی ڈاکٹر تھے، عبدا اللہ حسین نے، جو صدارت کے منصب پر فائز کیے گئے، مائیک سنبھالا، اور کہا: ''آج متعلقہ موضوع پر سیر حاصل گفت گو ہوئی۔'' اور ایک لمحے کا مسکراتا توقف کیا: ''اب اس لفظ سیر حاصل کا مطلب مجھے نہیں آتا!''

ہاں، یہ تب تھا، جب میں نے اداس اور نادار لوگوں کی کہانی بیان کرنے والے اس قد آور فکشن نگار میں شگوفے کھلتے دیکھے۔ اس فاصلے کو کم کرنے میں کراچی کی ایک کانفرنس میں مستنصر حسین تارڑ کے گرد گھومتے اُس سیشن کا بھی کچھ ہاتھ ہے، جس میں اسٹیج پر موجود عبداللہ حسین کو خراج تحسین پیش کرنے کے لیے، صاحب مجلس سمیت، پورا ہال اٹھ کھڑا ہوا۔ محمد حنیف کا تذکرہ بھی ضروری، جس نے دوران انٹرویو انھیں اِس عہد کا سب سے ''غیر اداس'' مصنف قرار دیا۔

تو عبداللہ حسین کے تخلیق کردہ پُرتاثیر ادب کے بعد، یہی وہ عوامل تھے، جن کے باعث کراچی کی ایک معتدل صبح جب میں نے اُنھیں، چھڑی ٹیکتے، آرٹس کونسل میں داخل ہوتے دیکھا، تو ان کا تعاقب خود پر لازم کیا۔ اور جانا کہ ٹی شرٹ اور ٹراؤزرز میں ملبوس یہ ادیب حقیقی معنوں میں انتہائی غیر اداس ہے۔ ایک زندہ دل انسان۔

یہ اُس مکالمے کی کہانی ہے، جو ٹکڑوں میں بٹا، جس کی تکمیل کے دوران جگہیں بھی تبدیل ہوئیں، پر یہ دھیرے دھیرے، فطری لاابالی پن کے ساتھ، آگے بڑھتا رہا۔ اِس میں آف دی ریکارڈ باتیں ہوئیں، قہقہے لگے، اور ایک لمحے کو اُن کے فہمائشی انداز سے روبرو ہونے کا بھی موقع ہاتھ آیا۔

عبداللہ حسین تخلیقی ادب کو ایک حد تک ذاتی شے تصور کرتے ہیں، مگر ابلاغ کی اہمیت کے قائل ہیں۔ یہی وہ کلیہ ہے، جس پر وہ حتی الامکان کاربند رہنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ذرا اُن کے حالاتِ زندگی پر اچٹتی سے نگاہ ڈال لی جائے:

اصل نام: محمد خان۔ سن پیدایش: 14 اگست 1931۔ جائے پیدایش: راول پنڈی، جہاں والد ملازمت کے سلسلے میں مقیم تھے۔ پانچ برس کی عمر میں اپنے آبائی شہر، گجرات میں قدم رکھا۔ اگلے سولہ برس وہیں رہے۔ 1952 میں بی ایس سی کرنے کے بعد ضلع جہلم کی ایک سیمنٹ فیکٹری میں بہ طور کیمسٹ ملازم ہوگئے۔ پھر داؤد خیل (میانوالی) کی سیمنٹ فیکٹری میں بہ طور کیمسٹ تقرر ہوا۔ 1959 میں کولمبو پلان فیلو شپ کے تحت کیمیکل انجینئرنگ میں ڈپلوما حاصل کرنے کینیڈا چلے گئے، مگر اس سے قبل داؤد خیل میں ایک واقعہ رونما ہو چکا تھا، جہاں کی یک سانیت نے قلم سنبھالنے کی تحریک دی، اور یوں ''اداس نسلیں'' کا آغاز ہوا، جس کی تکمیل میں پانچ برس لگے۔

ناول کی اشاعت کے لیے ''نیا ادارہ'' نے ہامی بھری۔ اُس وقت ان کی کوئی تحریر شایع نہیں ہوئی تھی، سو طے پایا کہ وہ ناول کی اشاعت سے قبل ایک کہانی لکھیں، جو ''سویرا'' میں شایع ہو کر

انھیں بہ طور ادیب متعارف کروائے۔ یوں 1962 میں ''ندی'' منصۂ شہود پر آئی، جس کا شمار ناقدین اُن کی بہترین تخلیقات میں کرتے ہیں۔ 1963 میں ''اداس نسلیں'' کی اشاعت نے تہلکا مچا دیا۔ بہتوں نے اِسے اردو کے بہترین ناولوں میں شمار کیا۔ آدم جی ادبی ایوارڈ حصے میں آیا۔

60 کی دہائی کے آخر میں وہ انگلینڈ چلے گئے تھے۔ 1976 میں مستقل قیام کے ارادے سے وطن لوٹے، پر اِدھر حالات سازگار نہ پا کر دوبارہ بیرون ملک سدھار گئے۔ 1981 میں پانچ کہانیوں اور دو ناولٹوں پر مشتمل مجموعہ ''نشیب'' شایع ہوا۔ اُن کے ایک ناولٹ ''واپسی کا سفر'' پر بی بی سی نے Brothers in Trouble کے نام سے فلم بھی بنائی، جس میں ہالی وڈ کے اداکاروں کے ساتھ معروف بھارتی اداکار اوم پوری نے بھی کام کیا۔ ''نشیب'' پر پی ٹی وی نے ڈراما سیریل بنائی، جسے بے حد پسند کیا گیا۔ ''اداس نسلیں'' کے اٹھارہ برس بعد ان کا دوسرا ناول ''باگھ'' شایع ہوا۔ عبداللہ حسین کو ذاتی طور پر یہ ناول ''اداس نسلیں'' سے زیادہ پسند ہے۔ 1989 میں ''قید'' کی اشاعت عمل میں آئی۔ ''رات'' 1994 میں چھپا، جس کے دو سال بعد اُن کا ضخیم ناول ''نادار لوگ'' منظر عام پر آیا۔ 2012 میں چھے کہانیوں پر مشتمل مجموعہ ''فریب'' شایع ہوا۔ انگلینڈ میں قیام کے دوران عبداللہ حسین نے ''اداس نسلیں'' کا ترجمہ بھی کیا، جو The Weary Generations کے عنوان سے چھپا، تو اسے انگریز ناقدین کی توجہ بھی حاصل ہوئی۔ سنڈے ٹائمز نے اپنے تبصرے میں اِسے بے حد سراہا۔ انگریزی میں اُن کا ناول Emigre Journeys شایع ہو چکا ہے۔ Afghan Girl کے نام سے ایک ناول زیرطبع ہے۔ سینئر مترجم، محمد عمر میمن کے قلم سے اُن کی نگارشات کے تراجم Stories of Exile and Alienation اور Night & other stories کے عنوان سے انگریزی میں چھپ چکے ہیں۔

اب گفت گو پیش خدمت ہے:

اقبال: آپ انتہائی خوش باش، زندہ دل آدمی، اور تذکرہ اداس نسلوں کا کرتے رہے؟

عبداللہ حسین: مجھے اس بات کی سمجھ نہیں آتی۔ جو لوگ تبصرہ وغیرہ کرتے ہیں، سب ہی نے یہ لکھا کہ میری تحریر، میرے کرداروں میں یاسیت ہے، غم زدگی ہے، ٹریجڈی ہے۔ البتہ یہ میرا temperament نہیں۔ میں تو ایک خوش دل آدمی ہوں۔ ہر وقت ہنستا رہتا ہوں۔ لوگوں کو تجزیہ کرنا چاہیے کہ میرے مزاج اور میرے کرداروں میں یہ فرق کیوں ہے۔

اقبال: کیا آپ نے خود بھی یہ فرق محسوس کیا یا یہ فقط ناقدین کی رائے ہے؟

عبداللہ حسین: میں اس بارے میں کوئی تبصرہ نہیں کرسکتا، مگر ہر ایک نے یہی کہا ہے۔ (ہنستے ہوئے) اب لوگ کہتے ہیں، تو پھر ٹھیک ہی کہتے ہوں گے۔

اقبال: آپ مختلف سیمینارز میں یہ کہتے نظر آئے کہ آپ اردو نہیں جانتے، جس زبان میں کئی شہ پارے تخلیق کیے، اس زبان سے لاعلمی کے اظہار کا سبب؟

عبداللہ حسین: ہم نے آٹھویں تک اردو پڑھی۔ پھر انگریزی پڑھنا شروع کی۔ سب یہی کہتے تھے کہ انگریزی پڑھو گے، تو نوکری ملے گی۔

اقبال: آپ کے والد بھی یہی کہا کرتے تھے کہ انگریزی پڑھو، ورنہ نیکر پہن کر چائے بیچنی پڑے گی...

عبداللہ حسین: (ہنستے ہوئے) یہ بھی ایک اسٹوری ہے۔ انھوں نے 1899 میں میٹرک کیا تھا۔ ان کی انگریزی بہت اچھی تھی۔ گورنمنٹ سروس میں تھے۔ وہ مجھ سے کہتے تھے کہ انگریزی پڑھو۔ ورنہ دیکھا ہے ناں کہ اسٹیشنوں پر لوگ میلی سی نیکر پہن کر چائے بیچتے ہیں، تم بھی نیکر پہن کر چائے بیچو گے۔ اب چائے بیچنے میں تو مجھے کوئی عار نہیں تھا، مگر نیکر پہننے والوں کا جو نقشہ میرے ذہن میں آتا تھا، وہ اچھا نہیں لگتا تھا۔ تو میں نے انگریزی پڑھنے کی شروعات کی۔ اگلے بیس پچیس سال تک انگریزی پڑھی۔ کالج میں ہمارے ایک پروفیسر تھے؛ سعید خان۔ انھوں نے کہا؛ میں پورے سال آپ کو کچھ نہیں پڑھاؤں گا۔ یہ دس ناولوں کی لسٹ ہے۔ ان میں سے کوئی تین پڑھ لیں۔ آخر میں ان ہی سے متعلق پوچھوں گا۔ اگر پڑھے ہوں گا، تو اپنے مضمون میں پاس کر دوں گا۔ تو اس طرح یہ سلسلہ دراز ہوتا گیا۔

اقبال: تو جب ناول لکھنے بیٹھے، اور جہاں اردو لفظ نہیں سوجھا، وہاں انگریزی یا پنجابی کا لفظ لکھ دیا؟

عبداللہ حسین: ہاں، جب مجھے کوئی لفظ نہیں آتا، تو میں اپنا لفظ بنا لیا کرتا تھا۔ بعد میں کچھ لوگوں نے کہا؛ عبداللہ حسین نے پنجابی میں ناول لکھا ہے۔ مگر جو کچھ مناسب قسم کے لوگ تھے، انھوں نے کہا کہ اُن کی اردو پر انگریزی اور پنجابی کا گہرا اثر ہے۔ شاید یہ بات بھی درست ہے۔

اقبال: ''اداس نسلیں'' کے نعیم کا شمار اردو ناول کے یادگار کرداروں میں ہوتا ہے۔ اوائل میں فکشن نگار کے سامنے اپنی ہی شخصیت ہوتی ہے۔ تو نعیم میں کہیں عبداللہ حسین بھی تھا؟

عبداللہ حسین: مجھ میں اور دیگر ناول نگاروں میں ایک فرق ہے۔ جتنے بھی ناول نگار ہیں، بشمول انگریزی کے، اکثریت کے پہلے ناول میں سوانحی عنصر ہوتا ہے۔ کیوں کہ ان کا تجربہ وہی ہوتا ہے، جسے وہ بیان کرتے ہیں۔ پھر اگر وہ مزید لکھیں، تو ان میں دوسروں کو موضوع بناتے ہیں۔ میں نے انگریزی کے ناول بھی بہت پڑھے ہیں، ان پر تنقید بھی پڑھی ہے۔ تو بیش تر پہلے ناولوں میں واضح آٹوبائیوگرافیکل عنصر ملتا ہے۔ مگر میرے کسی ناول میں یہ عنصر نہیں۔ ہاں، ایک دو کہانیوں میں ہے، جیسے ''نشیب'' کی کہانیاں۔ لیکن ناولوں میں ایسا کچھ نہیں۔ میں نے دوسروں کو اپنا کردار بنایا، اور یہ شعوری طور پر نہیں تھا۔ میرا خیال ہے کہ اچھے فکشن میں لکھنے والے کو غیر حاضر رہنا چاہیے۔

اقبال: گذشتہ پانچ عشروں نے ''اداس نسلیں'' کی شہرت کو مہمیز کیا۔ آپ کو لگتا ہے کہ اس کی شہرت کے باعث ''باگھ'' اور دیگر ناول نمایاں نہیں ہو سکے؟

عبداللہ حسین: ہاں، یہ درست ہے۔ مجھے اپنے ناولوں میں ''باگھ'' زیادہ پسند ہے۔ اب لوگ اس کا تذکرہ کرنے لگے ہیں۔ مگر شروع میں جب ''باگھ'' لکھا، ''نادار لوگ'' لکھا، تو وہ ''اداس نسلیں'' کے

سائے میں آ گئے۔ پیچھے چلے گئے۔

اقبال: ''باگھ'' اور ''اداس نسلیں'' کے درمیانی وقفے کے بارے میں کچھ فرمائیں؟

عبداللہ حسین: یہ بھی ایک کہانی ہے۔ ناول شایع ہونے کے بعد میں راتوں رات مشہور ہو گیا۔ اشاعت کے اگلے دن سے میرا شمار مشہور رائٹرز میں ہونے لگا۔ پھر میں سب چھوڑ کر انگلینڈ چلا گیا۔ لوگوں نے، میرے اپنے خاندان والوں نے کہا کہ آپ کیوں جا رہے ہیں؟ آپ اتنے مشہور ہیں، کوئی رسالہ نکالیں۔ اس کے ایڈیٹر بن جائیں۔ بہت سے ادیب آپ کے اردگرد آ جائیں گے۔ پھر ایک اخبار نکالیں۔ آپ سیاست میں جا سکتے ہیں۔ ملک میں بہت بڑی پوزیشن بن جائے گی۔ لیکن مجھے ان باتوں میں کوئی کشش محسوس نہیں ہوئی۔ میں انگلینڈ چلا گیا۔ میں نے ایک بڑے ناول نگار کا مقولہ پڑھ رکھا تھا: You are only as good as your second novel۔ یعنی آپ کا دوسرا ناول اچھا ہے، تو پھر آپ اچھے ناول نگار ہیں۔ ورنہ ایک ناول تو کوئی بھی لکھ سکتا ہے۔ تو میں نے ارادہ کر لیا کہ میں اس وقت تک دوسرا ناول نہیں لکھوں گا، جب تک یہ احساس نہ ہو جائے کہ میں پوری طرح تیار ہوں۔ تو تیرہ برس تک ایک لفظ نہیں لکھا۔ جب میں تیار ہو گیا، تو میں نے ''باگھ'' لکھا۔ اور مجھے احساس تھا کہ جو انتظار کیا ہے، وہ ٹھیک ہے۔ اگر میں فوراً دو تین فضول ناول لکھ لیتا، تو بات نہ بنتی۔

اقبال: ''اداس نسلیں'' اور ''باگھ'' کی زبان میں فرق نظر آتا ہے، باگھ زیادہ چست اور گتھا ہوا ہے...

عبداللہ حسین: آپ نے بہت اچھا لفظ کہا؛ گتھا ہوا۔ ہاں، وہ زیادہ توجہ کے ساتھ لکھا گیا۔ آپ حیران ہوں گے کہ مجھے انگلینڈ میں رہتے اتنے برس ہو گئے تھے، مگر میں نے ''باگھ'' میں انگریزی کا ایک لفظ بھی نہیں لکھا۔ جب ناول چھپ گیا، تو لوگوں نے کہا؛ عبداللہ حسین کئی سال سے باہر رہ رہے ہیں، مگر ناول پڑھ کر محسوس ہوتا ہے کہ یہ آدمی اپنے گاؤں سے باہر نہیں نکلا۔ دراصل اگر آپ ناول نگاری کے آرٹ کے مطابق لکھیں، تو ناول بنتا ہے۔ ''نشیب'' کے دیباچے میں مَیں نے لکھا؛ ادب ایک طویل المیعاد کام ہے، ناول کا اصل امتحان وقت ہے۔ نقاد یا تبصرہ نگار جو مرضی کہتے رہیں، فرق نہیں پڑتا۔ اگر بیس تیس سال بعد تحریر پڑھی جا رہی ہے، تو پھر ٹھیک ہے۔ اگر غائب ہو جاتی ہے، تو پھر اچھی نہیں۔

اقبال: آپ نے متعدد بار ''اداس نسلیں'' کو محبت کی کہانی قرار دیا...

عبداللہ حسین: ہاں، یہ میں نے کہا تھا۔ میں آپ کے لیے محبت کی تعریف کرنا چاہوں گا۔ وہ یہ نہیں ہے کہ آپ کے پڑوس میں ایک لڑکی رہتی ہے، آپ کا اور اس کا رابطہ ہو جاتا ہے۔ آپ کے گھر والے ان کے ہاں رشتہ لے جاتے ہیں۔ وہ بھی راضی ہو جاتے ہیں۔ آپ کی شادی ہو گئی۔ آپ بھی خوش، گھر اور محلے والے بھی خوش۔ اور لوگ کہتے ہیں، یہ محبت کی شادی ہے۔ This is nonsense۔ محبت کی تعریف یہ ہے کہ آپ اس کی خاطر کس کس شے کی قربانی دے سکتے ہیں۔ ''اداس نسلیں'' میں عذرا ایک نواب کی بیٹی ہے، نعیم ایک کسان کا بیٹا، جس کے پاس کسی قسم

کے وسائل نہیں۔ اس کے لیے عذرا اپنے پورے خاندان سے، اپنی کلاس سے بغاوت کر کے سب کچھ چھوڑ دیتی ہے۔ نکتہ یہ ہے کہ What are you prepared to give up? تو اس نے نعیم کے لیے، جس کا بازو بھی کٹا ہوا تھا، سب کچھ چھوڑا دیا۔ یہ تھی محبت کی شادی۔

اقبال: اِس میں طبقاتی تقسیم کو بھی آپ نے منظر کیا؟

عبداللہ حسین: (ذرا الاتعلقی سے) ہاں، طبقاتی تقسیم بھی کہانی میں آتی ہے۔ نعیم کا بھائی علی کارخانوں میں کام کرتا ہے۔ عذرا نے اپنے طبقے سے بغاوت کی تھی۔ تو یہ ہے۔

اقبال: ناول کی تفہیم میں ناول نگار سے رجوع کرنے کے آپ خلاف ہیں؟

عبداللہ حسین: دراصل ناول نگار سے اس کے ناول کے بارے میں سوال کرنا مجھے عجیب لگتا ہے۔ ناول نگار نے لکھ دیا، لوگ اپنی سوچ کے مطابق پڑھیں، اُس کا تجزیہ کریں۔ جتنا آپ نے ادب کا علم حاصل کیا ہوگا، اتنا اچھا تجزیہ ہوگا۔ اگر آپ ایم اے کر لیتے ہیں، اگلے پانچ چھے برس اپنا اور باقی دنیا کا ادب پڑھتے ہیں، تو تھوڑا بہت علم آ جاتا ہے۔ اگلے بیس سال مستقل پڑھتے رہے، تو اور علم آ گیا۔ جتنا زیادہ ادب کا علم ہوگا، اتنا اچھا تجزیہ ہوگا۔ قاری کو خود ہی تجزیہ کرنا چاہیے۔ ناول نگار سے پوچھنا زیادتی ہے۔ اب مجھے نہیں پتا کہ میرے ناول اور کہانیاں کہاں اور کیسے پیدا ہوئے۔ لکھنے والا، خاص طور پر فکشن لکھنے والا بہت سی باتوں سے لاعلم ہوتا ہے۔ وہ نہیں جانتا کہ کہانیاں کہاں سے آئیں، کیسے پھیلتی چلی گئیں۔ اس سے سائنسی انداز میں سوال نہیں کیا جا سکتا۔ لکھنے والے کو بہت سی باتوں کا پتا نہیں ہوتا۔ فکشن میں دو جمع دو کا نتیجہ چھے بھی آ سکتا ہے اور پانچ بھی۔

اقبال: تو یہ اُس کی Instinct ہے، جبلت، ایک غیر اختیاری رجحان...

عبداللہ حسین: ہاں۔ اور یہ صلاحیت صرف فکشن نگار میں نہیں، دیگر تخلیق کاروں میں بھی ہوتی ہے۔ مصرع یا نئی کہانی ذہن میں کیسے پھوٹتی ہے؟ گھاس کا پتا کیسے نکلتا ہے؟ یہاں تک کہ یہ بھی نہیں بتایا جا سکتا کہ ایک سائنس داں کے دماغ میں پہلا خیال کیسے آتا ہے۔ ہاں، بعد میں تحقیق کر کے اُسے دریافت کر لیا جاتا ہے، مگر آپ اس کے ذہن میں جنم لینے والے پہلے خیال کے بارے میں پوچھیں، تو وہ (سائنس داں) اُس کا جواب اطمینان بخش نہیں دے سکے گا تو ادب میں دو جمع دو چار کا کلیہ کام نہیں کرتا۔

اقبال: آپ مغرب میں رہے، وہاں ادیب کو جو احترام ملتا ہے، یہاں اس کا فقدان ہے۔ اس کا سبب؟

عبداللہ حسین: ہمارا معاشرہ بالکل فضول ہے۔ لڑائی جھگڑے چل رہے ہیں۔ ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے خدا حافظ سے اللہ حافظ ہو گیا۔ میں تو ان چیزوں پر یقین نہیں رکھتا۔ ہمارے ہاں مذہب کی اصل روح ختم ہو گئی ہے، صرف رسومات رہ گئی ہیں۔ مذہبی لوگوں کی شروع سے آرٹ سے لڑائی ہے۔ پس ماندہ ممالک میں یہ رجحان غالب ہے۔ خوش حال ممالک میں یہ جھگڑا ختم ہو گیا۔ میں پاکستان کو Unreal society کہتا ہوں۔ جھوٹ، دغا بازی۔ یہاں ادیب کا کام بہت مشکل

ہوجاتا ہے۔ اسے انسانی قدروں کو اجاگر کرنا ہے۔ (کچھ سیکنڈز کا وقفہ لیتے ہوئے) مجھے ابھی ابھی خیال آیا کہ لوگ جو کہتے ہیں، میرے کرداروں میں مایوسی اور غم زدگی ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ مجھے اپنے اردگرد انسانی قدروں کی پامالی نظر آتی ہے۔ اور میں دیکھتا ہوں کہ لوگ اِسے نارمل سمجھ رہے ہیں۔ شاید اس وجہ سے میرے اندر مایوسی کی کیفیت پیدا ہوتی ہے، مگر وہ میری شخصیت نہیں۔ (مسکراتے ہوئے) اب یہ ایک بالکل نئی بات میں نے بتائی ہے۔ آپ کسی اور پیرایے میں لکھ دیں، بہت بڑے نقاد بن جائیں گے۔

اقبال: اردو فکشن کا مستقبل آپ کو کیسا نظر آرہا ہے؟

عبداللہ حسین: لوگوں میں لکھنے کی امنگ ہے۔ بہت سے لوگ لکھ رہے ہیں۔ افسانے اچھے لکھے جارہے ہیں، اور خاصے لکھے جارہے ہیں۔ تو مستقبل تو ہے۔

اقبال: آپ نے انسانی قدروں کی تذلیل کا تذکرہ کیا، تو فکشن نگار کو ان کی نشان دہی کرنی چاہیے؟

عبداللہ حسین: ہاں۔ یہ ادیبوں، فلسفیوں اور سوشل سائنٹسٹ کا کام ہے۔ تعلیم ہی سے ہر شے نکلتی ہے۔ تعلیم سے روشنی پیدا ہوگی، تو انسانی قدریں بھی اجاگر ہوں گی۔ ان کی نشوونما ہوگی۔ اگر تعلیم نہیں، تو ادیب بھی کوئی کردار ادا نہیں کرسکے گا۔ سوشل سائنٹسٹ تو ایک خشک قسم کا مضمون لکھ دیتا ہے، جو کچھ ہی لوگوں پر اثر کرتا ہے۔ مگر ادیب کا کام لوگوں کے دلوں تک پہنچتا ہے۔ شاعری میں، کہانی میں ایک کشش ہوتی ہے۔ الف لیلہ کے وقت سے، شہرزاد کے وقت سے انسان کہانی سے مسخر ہے کہ اب آگے کیا ہوگا۔ اگلے موڑ پر کیا ہے۔ ادیب کا کام لوگ آسانی سے جذب کر لیتے ہیں۔ اگر وہ انسانی قدروں کے بارے میں لکھے، تو وہ موثر ثابت ہوتا ہے۔

اقبال: تو کیا ادیب کو تبدیلی کے لیے، اصلاح کے لیے ادب تخلیق کرنا چاہیے؟

عبداللہ حسین: تحریک الگ معاملہ ہے۔ اس کے مقاصد ہوتے ہیں، منشور ہوتا ہے، جہاں تک ادیب کا تعلق ہے، اس کے ہاں یہ عمل لاشعوری ہونا چاہیے۔ جس طرح ترقی پسندوں نے ایک مہم شروع کی تھی کہ ایسا ادب تخلیق کیا جائے، ویسا ادب تخلیق کیا جائے، وہ ناکام ہوگئی۔ یہ غیر شعوری معاملہ ہے۔ ادب اچھا ہے، تو وہ لوگوں تک پہنچے گا، اور ان کے لاشعور کا حصہ بن جائے گا۔ جب صبح آپ کی آنکھ کھلتی ہے، تو ذہن میں کوئی کہانی یا کوئی شعر منڈلا رہا ہوتا ہے۔ یعنی لاشعور میں دفن خیال نیند کے بعد ظاہر ہوجاتا ہے۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ ادب آپ کے شعور میں اس گہرائی تک چلا گیا کہ وہ آپ کے لاشعور کا حصہ بن گیا ہے۔ اِسی سے تبدیلی آتی ہے۔

اقبال: ''اداس نسلیں'' پڑھا گیا، سراہا گیا، مگر اس کا ترجمہ نہیں ہوا، یہ کام آپ کو خود کرنا پڑا۔ قرۃ العین حیدر کو بھی یہ مرحلہ خود ہی انجام دینا پڑا تھا...

عبداللہ حسین: ہمارے لوگ سست اور کاہل ہیں۔ محنت نہیں کرتے۔ اس لیے ہم زندگی کے کسی شعبے میں ترقی نہیں کرسکے۔ تنزلی کی طرف جارہے ہیں، کیوں کہ ہم محنت سے جی چرانے والے لوگ ہیں۔ اتنے ضخیم ناول کا ترجمہ کرنا بڑی محنت کا کام ہے۔ چالیس برس تک میں انتظار کرتا رہا۔ سب

کہتے کہ جی بڑا اچھا ناول ہے۔ بھئی، اگر اچھا کہتے ہو، تو اس پر طویل تجزیاتی مضمون لکھو یا اس کا انگریزی میں ترجمہ کرو۔ تنگ آکر میں نے خود ہی ترجمہ کیا۔

اقبال: کیا ہمارے ہاں اس معیار کے مترجم ہیں، جو اردو ادب پارے کو انگریزی میں ڈھال سکیں؟

عبداللہ حسین: ہاں ہاں، بہت اچھی انگریزی لکھنے والے لوگ ہیں۔ انگریزی اخبارات میں ٹھیک ٹھاک مقالے لکھتے ہیں، مگر ہمارے لوگ کاہل ہیں۔ غیر تخلیقی ہیں۔ آج تک ہمارے معاشرے میں کوئی تخلیقی کام نہیں ہوا۔ ہمیں کرکٹ دیکھتے ہوئے پچاس سال ہوگئے، اس عرصے میں ''پاکستان زندہ باد'' کے علاوہ کوئی نعرہ ایجاد نہیں کرسکے۔ مجھے تو اس سے Nausea ہوتا ہے۔ دوسرے ملکوں میں آپ دیکھیں فٹ بال کے لیے کیسے گانے لکھے گئے، نعرے بنائے گے۔ تو یہ غیر تخلیقی لوگ ہیں۔

اقبال: آغاز ایک ضخیم ناول سے، پھر مختصر ناول، طویل مختصر افسانہ؛ مزاج کے زیادہ قریب کیا ہے؟

عبداللہ حسین: اس وقت میرا پسندیدہ رجحان ناویلا ہے، جسے ہمارے ہاں ناولٹ کہتے ہیں۔ ناولٹ کی تعریف ہی اور ہے۔ ناولٹ ہے ڈائجسٹوں میں خواتین کے لیے رومانوی طرز پر لکھی جانے والی طویل کہانیاں۔ ناویلا سنجیدہ فکشن ہے، جو سو سے ڈیڑھ سو صفحے کا ہوتا ہے۔ آج کل میری توجہ کا مرکز یہی ہے۔

اقبال: انگریزی میں بھی ایک ناویلا لکھ رہے ہیں؟

عبداللہ حسین: جی بالکل۔ وہ مکمل کرکے ایجنٹ کو دے دیا ہے۔ اب اردو میں ایک ناویلا شروع کیا ہے۔ ساتھ چھوٹی بڑی کہانیاں لکھوں گا۔ چھے کہانیوں کا مجموعہ ہوگا۔ میرے ذہن میں اُن کے خیالات ہیں۔ ہوسکتا ہے، تین ناویلا ہوجائیں اور تین مختصر کہانیاں۔ یعنی چھے کا ہندسہ ہے۔ آج کل تو جو کچھ rubbish لکھتا ہوں، چھپوا دیتا ہوں (قہقہہ)۔

اقبال: ہمارے ہاں ادیب رائلٹی کے معاملے میں شکوہ کرتے نظر آتے ہیں...

عبداللہ حسین: ایک طویل عرصے تو یہ مسئلہ رہا، مگر اب چند ادیبوں کو، جن کی کتابیں بکتی ہیں، رائلٹی ملتی ہے۔ لیکن مزے کی بات ہے کہ خود پیسے دے کر کتاب چھپوانے والے بھی بہت آگئے ہیں۔ سب کو شوق ہے کہ ان کی کتاب آجائے۔ بہت سے پبلشر ہیں، جو کہتے ہیں؛ ہم چھاپ دیں گے، اتنے پیسے لگیں گے۔ اور لوگ دے دیتے ہیں۔ البتہ اب رائلٹی دینے کا رواج ہوگیا ہے۔ ''سنگ میل'' والوں نے سب سے پہلے شروع کیا تھا۔ مجھے اچھی رائلٹی دیتے ہیں۔ تارڑ، انتظار حسین اور دیگر کو دیتے ہیں۔ اب میری کتابیں، چاہے سے چار پانچ سال بعد آئیں، مگر ٹھیک تعداد میں بک جاتی ہیں۔

اقبال: آپ اب 83 برس کے ہوگئے، تو لکھنے کا ڈھب کیا ہے؟ دن کا وقت مقرر یا شام کا؟

عبداللہ حسین: میں کرسی پر بیٹھ کر ہاتھ سے لکھتا ہوں۔ انگریزی ٹائپ کرتا ہوں۔ وقت کوئی مقرر نہیں۔ کبھی صبح لکھتا ہوں، کبھی شام۔ میں فارغ آدمی ہوں ناں۔ کہیں مجھے جانا نہیں۔ سو رہا ہوں،

تو سو رہا ہوں۔تو جو بھی وقت ملتا ہے، اِسی میں صرف کرتا ہوں۔

اقبال: زبیر رضوی کے پرچے ''ذہن جدید'' میں اردو ادب کے پروفیسرز کے درمیان ایک سروے ہوا، جس میں ''اداس نسلیں'' کو ''آگ کا دریا'' پر فوقیت دیتے ہوئے اردو کی تاریخ کا بہترین ناول قرار دیا گیا...

عبداللہ حسین: ہاں، وہ ''ذہن جدید'' والوں نے کروایا تھا۔قرۃ العین کا ''آگ کا دریا'' دوسرے نمبر پر آیا تھا۔ وہ اس وقت زندہ تھیں۔ میں نے سوچا، بھئی انھیں تو بڑا صدمہ پہنچے گا۔تو میں نے ایڈیٹر کو خط لکھا۔ میں نے کہا: لوگوں نے اس سروے میں ''اداس نسلیں'' کو ووٹ دیے ہیں، ان کی نوازش، لیکن میں خود قرۃ العین حیدر کو اردو کا سب سے بڑا ناول نگار مانتا ہوں۔ ویسے انھوں نے لکھا ہی بہت ہے۔ ساری عمر یہی کام کیا۔ ہم تو ادھر اُدھر کھیلتے رہے۔ خط بھیج کر اُنھیں بھی اطلاع دے دی۔ وہ بھی خوش ہوگئی ہوں گی۔

اقبال: آپ دو ناولوں کے درمیان موازنے کے رجحان کو کیسے دیکھتے ہیں؟

عبداللہ حسین: ہونا تو نہیں چاہیے۔ ناولوں کا الگ الگ مزاج ہوتا ہے، مگر لوگ کرتے آرہے ہیں، انھیں اور کوئی کام ہی نہیں ہے۔

اقبال: آپ کے ہم عصروں میں انتظار حسین ایک بڑا نام ہے...

عبداللہ حسین: میں اُنھیں سراہتا ہوں۔ وہ 90 سال کے ہو گئے ہیں۔ ساری عمر لکھا۔طویل اور مختصر کہانیاں۔ ناول۔ کالم۔ ان کی زندگی کا اثاثہ ادب ہے۔ اور یہ بلاشبہہ قابل تعریف ہے۔ انٹرنیشنل مین بکر پرائز والوں نے انھیں زندگی بھر کے کام پر چنا ہے۔

اقبال: اردو ناول پر بات ہو، تو تذکرہ ''آگ کا دریا'' اور ''اداس نسلیں'' سے آگے نہیں بڑھتا، کیا اور کوئی اچھا ناول نہیں لکھا گیا؟

عبداللہ حسین: لکھے گئے ہیں، اچھے ہیں۔ چند میں نے پڑھے بھی ہیں۔ مرزا اطہر بیگ نے دو ناول بہت اچھے لکھے۔ مستنصر حسین تارڑ نے کم از کم دو ناول اچھے لکھے ہیں۔ عاصم بٹ کا پہلا ناول اچھا ہے۔

اقبال: ادب کے شایقین کے لیے کیا تجویز کریں گے؟

عبداللہ حسین: میں اِس طرح کی تجاویز پر یقین نہیں رکھتا۔ یہ ادب کے اساتذہ کا کام ہے۔ سب کچھ پڑھنا چاہیے۔ میں تو یہ کہوں گا کہ جتنا زیادہ آپ پڑھیں گے، اتنا علم وسیع ہوگا۔ ایک مقام پر یہ صلاحیت پیدا ہو جائے گی، تب آپ ناول کے اچھے یا برے ہونے سے متعلق خود ہی فیصلہ کرسکیں گے۔ میرا تو خیال ہے کہ لوگوں کو زیادہ سے زیادہ پڑھنا چاہیے۔

اقبال: آپ اردو ناقدین سے مطمئن نہیں۔ کیا یہی شکایت ہے کہ وہ پڑھتے نہیں؟

عبداللہ حسین: سست ہیں۔ چالیس سال پرانے دور میں جی رہے ہیں۔ نئی چیزیں پڑھتے نہیں۔

اقبال: بیرونی ادیبوں میں کون پسند ہیں؟

عبداللہ حسین: ولیم فاکنر میرا فیورٹ ہے، لیکن سب سے بڑا ناول نگار تو دوستوفسکی ہے۔ مارکیز کا آج کل Craze ہے، مگر مجھے اس کے ناول سمجھ میں نہیں آئے۔ ہاں، میلان کنڈیرا نے ایک نئی قسم کا ناول ایجاد کیا ہے۔ یہ بڑی بات ہے۔ جیسے میں نے ''فریب'' کی کہانیوں کو دو تین حصوں میں تقسیم کر کے لکھا ہے، پہلے حال کا تذکرہ، پھر ماضی کی کہانی۔ میں نے یہ نیا تجربہ کیا۔ لوگوں نے پسند کیا۔

اقبال: اردو فکشن نگاروں کا اتنا چھوٹا سا قبیلہ، اِس میں بھی گروہ بندیاں؟

عبداللہ حسین: گروہ بندیاں تو ہر جگہ ہوتی ہیں۔ ہمارے ہاں سیاست کی وبا پھیل گئی ہے۔ ذرائع ابلاغ میں سب سے مضبوط ہے ٹی وی۔ اُس پر سیاست کے علاوہ کوئی بات نہیں ہوتی۔ سیاست ہی کو انٹرٹینمنٹ بنا دیا ہے۔ یہ بڑی مصیبت ہے۔ سیاست کی نیچر گروہ بندی ہے۔ تو وہاں سے یہ وبا ادب میں بھی آگئی ہے۔ کراچی والوں سے مجھے شکوہ ہے۔ اردو فکشن میں پنجاب کا بڑا حصہ ہے، جسے آپ نظر انداز نہیں کر سکتے، لیکن آپ ماننے کو تیار نہیں، گروہ بنا لیتے ہیں، تو آپ کو متعصب ہی کہا جائے گا۔ خیر، میری تو یہ لوگ بہت عزت کرتے ہیں۔ اور پھر مجھے اِس عمر میں ان باتوں سے کوئی فرق بھی نہیں پڑتا۔

اقبال: ہمارے ادیب اور شعراء یا تو سوٹ میں نظر آتے ہیں، یا کرتے پاجامے میں، آپ کا لباس سب سے مختلف۔ یہ سہولت ہے یا روایت سے بغاوت کی شکل؟

عبداللہ حسین: مجھے کپڑوں کا کوئی شوق نہیں۔ میں کراچی میں ایک ہوٹل میں ٹھہرا ہوا تھا۔ ہمارے ایک نوجوان دوست میرے کمرے میں آئے۔ میری چپل ٹوٹی ہوئی تھی۔ اُنھوں نے مجھ سے تو کچھ نہیں کہا، مگر اپنے ایک دوست سے کہنے لگے؛ بھئی عبداللہ حسین کی چپل ٹوٹی ہوئی تھی، اُن کے لیے کچھ پیسوں کا انتظام کیا جائے (قہقہہ)۔ تو میرا یہی معاملہ ہے۔ لباس اور کھانے پینے کے معاملے میں رکھ رکھاؤ کا قائل نہیں۔

☆☆☆☆☆

ڈاکٹر محمد سہیل کی مرتب کردہ کتاب

نعت نامے

بنام: صبیح رحمانی

صفحات: 934 قیمت 1000 روپے

ناشر: نعت سینٹر، B-306، بلاک 15، گلستانِ جوہر، کراچی

فون: 0333-2457575